رموزِ بیخودی پر ایک انتقادی نظر

سید سلیمان ندوی

مدت سے ارادہ تھا کہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے لیکن کثرت مشاغل اور قلت فرصت نے موقع نہ دیا۔ ابھی اُن کی ایک مثنوی رموزِ بیخودی موصول ہوئی ہے۔ اس تقریب سے اب خیالات کے عرض کا کسی قدر موقع مل گیا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پبلک آغاز مخزن لاہور کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کے قریب قریب نکلنا شروع ہوا تھا۔[۱] اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کی پبلک شاعری کی عمر تقریباً ۱۶ برس ہے اور اس عرصے میں اُن کی متعدد چھوٹی بڑی نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے اکثر کی اہلِ معنی نے داد دی اور بعض پر اہلِ ظاہر نے گرفت کی۔

ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفرین واقع ہوئی ہے۔ کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے اُنھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں بھی نظمیں لکھیں، لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت ایک عام اُردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی۔[۲]

کائنات کے اسرار و حقائق کی تعلیم و تلقین کے لیے ہمیشہ سے چار راستے رہے ہیں: مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری۔ مذہب کی اصلی حیثیت ایک قانون اور فرمانِ شاہی کی ہے۔ اس کی پیروی اس لیے چاہیے کہ یہ خداوندِ عالم کا حکم اور فرمان ہے اور بندوں کو اس کی تسلیم سے چارہ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مصلحت اور حکمت پر بھی مبنی ہے۔ فلسفہ اپنی بنیاد دلائل اور براہین پر قائم کرتا ہے اور وہ انسان کی عقل اور دماغ کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تصوف انسان کے ذوقِ باطن اور لذّتِ وجدانی کو اپنا رہبر بناتا ہے اور شاعری مخاطب کے انسانی، قومی، اخلاقی اور مذہبی جذبات کے سہارے کھڑی ہوتی ہے۔

سچ بولنا انسانیت کا اصلی جوہر ہے لیکن یہ کہنا کہ سچ بولو کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ ہمیشہ سچ بولا کرو، یہ مذہب کی زبان ہے۔ سچ بولو، کیونکہ سچائی سے انسان کی عزت برقرار اور جماعت پر اس کا اعتماد قائم ہوتا ہے،

فلسفے کی بولی ہے۔ اور سچ بولو کہ سچائی سے دل میں ایک خاص قسم کی لذتِ نورانی حاصل ہوتی ہے، تصوف کی تعلیم ہے۔ اور سچ بولا کرو کہ تم اس قوم کے فرزند ہو جس نے صداقت اور راستی پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں، سچ بولو کہ فطرت ہمیشہ سچ بولتی ہے۔ پھول کی خوشبو کبھی ارادی غلطی سے اپنے کو بدو نہیں کہتی، روشنی اپنے آپ کو کبھی تاریکی نہیں کہہ سکتی، یہ دونوں شاعری کے محاورے ہیں۔[۳]

یہ مختلف راستے ہمیشہ سے الگ الگ تھے لیکن سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چند صدیوں کے بعد اسرائیلی پیغمبروں میں مذہب اور شاعری کی مخلوط راہیں نظر آتی ہیں۔ حضرتِ داودؑ کی مزامیر، حضرت سلیمانؑ کی غزلوں اور اخیر زمانے کے عبرانی پیغمبروں کے الہامی کلاموں میں، اور سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مواعظ میں، مذہب اور شاعری دوش بدوش مصرفِ کارفرمائی ہیں۔

اسلام میں عربوں کا عنصر جب تک غالب رہا، یہ طریقے باہم مزج نہیں ہوئے۔ عجمیت کے اثر نے جو نتائج پیدا کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ تعلیم و تلقین کے یہ مختلف اُسلوب ایک صف میں آ کر انسان کو ہر راستے سے متاثر کرنے لگے۔ پہلے یہ تھا کہ انسان اپنے ذوق اور مناسبتِ طبع کی بنا پر اُن میں سے ایک راستے کو اپنے لیے انتخاب کر لیتا تھا لیکن عجم کے صوفیوں نے دیکھا کہ اس طریقے سے بہت کم تعداد ہماری گرفت میں آتی ہے۔ اُنھوں نے چاروں کو ملا کر ایک کر دیا تا کہ ہر مخاطب انسان ان میں سے کسی ایک پر ضرور ہے کہ سر ڈال دے گا۔

ہمارے خیال میں حکیم سنائیؒ پہلے شخص ہیں جو اس طریقۂ خاص کے موجد ہیں اور اس کے بعد مولانائے روم کے عہد میں یہ فن عروجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ مولوی رومی نے اپنے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یک جا کر دیے۔ اور چونکہ وقت کی چیز تھی اس لیے اہلِ معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی اور اب بھی وہ مقبول ہے اور ایک حد تک اُس نے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی تک شعرائے باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک اور حدیثِ قدسی کی جو کچھ تفسیریں اُنھوں نے کیں، ہمارے حاکمانہ غیظ و غضب، فاتحانہ جوش و خروش اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لیے وہ ضروری تھا۔

لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے اور ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آ گیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اُسی پُرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو بُردِ اطراف کے بعد شاید وہ بُردِ قلب کا باعث ہو جائے، اس لیے ضرورت تھی کہ ہمارے اہلِ دل شعرا مثنوی مولوی روم کا دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں۔

شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لیے چُن لیا۔ اُنھوں نے اس مقصد

کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں: اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی۔ پہلی مثنوی میری نظر سے نہیں گزری، البتہ رداً اور اعتراضاً اس کے بعض بعض ٹکڑے اخبارات میں دیکھے۔ اس سفر میں مجھے محمد علی کی زبان سے اُس کے متعدد ابواب سننے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سنائے کہ میں سراپا اثر ہو گیا۔ شاعر نے جو کچھ کہا تھا اُس کو ایک بہتر مفسّر کی زبان سے سن کر خود بخود اُس کے اسرار و حکم کے عقدے وا ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحوں میں عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھپی ہے۔ زبان فارسی اختیار کر گئی ہے اور یہ شاید اس لیے تا کہ فوائد ہندوستان کی دیواروں تک محدود نہ رہیں، بلکہ دُنیا کی وہ تمام آبادی، جس کی حیاتِ ملی کو اس میں خطاب کیا گیا ہے، اُس کو سمجھ سکے۔

زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو اُن شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں۔ مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُترے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لیے اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔

زیرِ تقریظ مثنوی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرارِ خودی سے بہتر ہے۔[۵] اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہرِ سیاست بیشتر اور اُس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزلِ مقصود ایک ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، حکمائے ملت ان میں مسلمانوں کے مزاجِ قومی کی تشخیص نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں؛ مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی ان دو مثنویوں میں۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں۔

رموزِ بیخودی ہے جس کا اصل مقصود ''ملتِ اسلامیہ کے اسرارِ حیات کی تشریح'' ہے، حسبِ ذیل عنوانوں پر منقسم ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی راہِ ترقی کے حسبِ ذیل منازل ہیں:

(۱)　　افراد اور قوم میں باہمی نسبت۔

(۲) قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلے میں منسلک کر دیتا ہے۔

(۳) ملت اسلامی کے اساسی ارکان میں سے پہلا رکن توحید ہے اور توحید کے معنی ہیں ایک ذاتِ برتر کے آگے اپنے کو ہیچ اور بے مقدار جان کر تمام دُنیا سے بے خوف اور نڈر ہو جانا۔

(۴) جس طرح ایک فرد کے لیے آخری لمحہ حیات وہ ہے جب وہ اپنے وجود سے مایوس اور نا اُمید ہو جائے، اسی طرح قوموں کی زندگی کے خاتمے کا دن وہ ہے جب وہ اپنی قومی زندگی سے نا اُمید اور مایوس ہو جائیں۔ مسلمانوں کی قوم میں آج جو افسردہ دلی اور موت سے نظر آتی ہے وہ اسی طرح کے حزن و ملال اور یاس کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ چیزیں اپنے دل سے صاف نکال دینی چاہیں اور اس میں کامیابی صرف تکمیل ایمان سے ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ لا تقنطوا من رحمة اللّٰہ[۶] اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی لیے لا تخف ولا تحزن[۷] اور مسلمانوں کی لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵) ملت کا دوسرا رکنِ اساسی اقرارِ رسالت ہے اور بغیر اس کے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، قومیت کا شیرازہ نہیں بندھتا۔

اس کے بعد شاعر نے نہایت عمدہ پیرایہ قصص و حکایت میں حسبِ ذیل امور کی تشریح کی ہے:

۱- حکایتِ بوعبیدہ و جاپان در معنیٰ اخوتِ اسلامیہ۔

۲- حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنیٰ مساواتِ اسلامیہ۔

۳- در معنیٰ حریتِ اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا۔

۴- در معنیٰ اینکہ چوں ملتِ محمدیہ مؤسس بر توحید و رسالت است، پس نہایتِ مکانی ندارد (یعنی اس کی جغرافی تحدید نہیں ہو سکتی بلکہ تمام دُنیا اس میں شامل ہو سکتی ہے)۔

۵- در معنیٰ اینکہ ملتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ہم ندارد کہ دوامِ ایں ملتِ شریفہ موعود است (اس کے یقین سے مسلمانوں کا حزن و یاس دور ہو گا)۔

۶- در معنیٰ اینکہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است۔

۷- در معنیٰ اینکہ پختگیٔ سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است۔

۸- در معنیٰ اینکہ حسنِ سیرتِ ملیہ از تادب باداب محمدیہ است۔

۹- در معنیٰ اینکہ حیاتِ ملیہ مرکز محسوس می خواھد و مرکزِ محسوس ملتِ اسلامیہ بیت الحرام است۔

۱۰- در معنیٰ اینکہ جمعیتِ حقیقت از محکم گرفتنِ نصف العینِ ملیہ است، و نصب العینِ اُمتِ محمدیہ

حفظ ونشرِ توحید است۔

۱۱- درمعنیٔ اینکہ توسیع حیاتِ ملیہ از تسخیرِ قوائے نظامِ عالم است۔

۱۲- درمعنیٔ اینکہ کمالِ حیات ملیہ این است کہ ملت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند و تکمیلِ ایں احساس از ضبطِ روایاتِ ملیہ ممکن گردد۔

۱۳- درمعنیٔ اینکہ بقائے نوع از اُمومت است وحفظ واحترامِ امومت اصلِ اسلام است۔

۱۴- درمعنیٔ اینکہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ است برائے نسائے اسلام۔

۱۵- خلاصہ مطالبِ مثنوی درتفسیر سورۂ اخلاص۔

شاعر نے ان مطالبِ پانزدہ گانہ میں سے ہر ایک کو واقعات، حکایات اور آیاتِ قرآن اور حدیث سے محکم کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبی سے اس انگشتری کا نگینہ بنتی چلی گئی ہیں۔ جہاں تک ہمارے مطالعے نے کام دیا ہے، احادیث میں دفعہ ۱۴ کے علاوہ اور تمام واقعات صحیح ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی ابیات، جن کا عنوان ''پیش کش بحضورِ ملتِ اسلامیہ'' ہے، یہ ہیں:

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایتام کرد
اے مثالِ انبیاء پاکانِ تو
ہمگرِ دلہا، جگر چاکانِ تو
اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
جلوہ ہائے خویش را نشناختہ
اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو
اے تماشا گاہِ عالم روے تو
ہمچو موج آتشِ تہ پا میروی
تو کجا بہرِ تماشا می روی
اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
رمزِ سوز آموز از پروانہ
در شرر تعمیر کن کاشانہ

یہ مثنوی بھی ڈاکٹر اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقید لفظی اور معنوی سے بری نہیں ہے۔[8] تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر روان اور سلیس البیانی کے ساتھ مؤثر ہیں کہ بار باران اشعار کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خوف و یاس کی بُرائی میں لکھتے ہیں:

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی
خفتہ باغم در تہِ یک چادر است
غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است
ایک در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ لا تحزن بگیر
ایں سبق، صدیق را صدیق کرد
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو
دشمنت ترساں اگر بیند ترا
از خیابانت چو گل[9] چیند ترا
ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد
ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد
بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما
ہر شر پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا پیراہنش
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ ﷺ فہمیدہ است

شرک او را در خوف مضمر دیدہ است

اتباعِ شریعت کے باب میں لکھا:

اے کہ باشی حکمتِ دیں را امین
با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب
بسا مسلماں در ادائے مستحب
مستحب را فرض گردانیدہ اند
زندگی را عینِ قدرت دیدہ اند
روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
از خیالِ صلح گردد بے خطر
گیرد آساں روزگارِ خویش را
بشکند حصن و حصارِ خویش را
سرِ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطرھا زندگی ست
شرع می خواھد کہ چوں آئی بجنگ
شعلہ گردی، واشگافی کامِ سنگ
آزماید قوتِ بازوئے تو
می نہد الوند پیشِ روئے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را
از تفِ خنجر گداز الوند را
نیست میشِ ناتوانے لاغرے
درخورِ سر پنجۂ شیرِ نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود
از شکارِ خود زبوں تر می شود
خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی، آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

اسی طرح تمام بیان مسلسل، بلند تر اور پُر اثر ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے عالمگیر اور اکبر کی نسبت اپنا جو خیال ضمناً ظاہر کیا ہے، اب اکثر اربابِ فکر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبارِ دودمانِ گورگاں
پایہ اسلامیاں برتر ازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو
درمیانِ کار زار کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمعِ دل در سینہ ھا روشن نبود
ملتِ ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ھند عالمگیر را
آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دیں در محفل ما بر فروخت
کور ذوقاں داستاں ھا ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود

چوں براہیمؑ اندریں بتخانہ بود

اسی طرح مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق، فلسفیانہ تشریح کے ساتھ، صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں۔

ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کے صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال کی صحت میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اس میں حل کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں۔

(معارف، اپریل ۱۹۱۸ء)

حوالہ جات وحواشی

۱- مخزن (لاہور) کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء کو شائع ہوا۔
۲- یہ رائے دورِ آغاز کے کلام کے بارے میں ہے۔
۳- سیّد صاحب کے ایک دوست قاضی عبدالوحید صاحب نے اُن کے خیال کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

کیا چیز ہے شعر؟ سن لو گفتار ہے وہ
(قول)

کیا اصل ہے فلسفے کی؟ پندار ہے وہ
(علم)

مذہب کسے کہتے ہیں؟ تصوف کیا ہے؟
کردار اگر ہے یہ، تو رفتار ہے وہ
(فعل قلب)　　(فعل جوارح)

۴- غزنی کے مشہور شاعر (روم ۱۱۳۱ء)۔ متعدد مثنویاں اُن سے یادگار ہیں جن میں ''حدیقہ'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔
۵- رموزِ بیخودی کی زبان کے لیے مکاتیب ملاحظہ ہوں۔
۶- زمر:۵۳ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)۔
۷- عنکبوت:۳۳ (نہ خوف کھا اور نہ ملال کر)۔
۸- ملاحظہ ہو 'مکاتیب اقبال بنام سید صاحب'۔
۹- اس تشبیہ میں کم از کم مجھ کو کلام ہے (س)۔
۱۰- شاید یہ فارسی محاورہ ہو۔ (س)